٦

اوسلومعاہدہ مر چکا

اسرائیلی فلسطینی امن عمل کو نتیجہ خیز کیسے بنایا جائے

سلام فیاض

خلاصہ

فلسطینی اتھارٹی کے سابق وزیراعظم نے اس مضمون میں دو معاملات پر اظہار خیال کیا ہے۔ پہلی تجویز امن عمل اور قومی حکومت دونوں حوالوں سے فلسطین کی نمائندگی سے متعلق ہے جب کہ دوسری اوسلوطریق کار کے اب تک قابل عمل ہونے کے سوال کو چیلنج کرتی ہے۔ جوردوبدل تجویز کیا جا رہا ہے، اس کا مقصد مختصراً یہ ہے کہ قابض (اسرائیلی) ریاست اور مقبوضہ لوگوں کے درمیان طاقت کے توازن میں پائے جانے والے بنیادی عدم تناسب کو درست کیا جائے۔

اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان اگست ۲۰۱۴ء میں ہونے والی جنگ بندی عداوتوں کے درمیان محض ایک عارضی وقفہ نہیں، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اگرچہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے تاہم بہت سے لوگوں نے اس سے پہلے ہی اگلے مراحل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اس دلیل کے ساتھ کہ اب اس تنازع کے اصل اسباب کو زیر بحث لانے اور ان کا ازالہ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس بات سے اتفاق کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اس کے نتیجے میں قیام امن کا رکا ہوا عمل فوری طور پر شروع ہو جائے گا۔ یہ عمل بار بار ناکام ہو چکا ہے اور اس کا ناکام ہوتے رہنا اس وقت تک

لامحالہ یقینی ہے جب تک کہ اس کے موجودہ اسلوب یعنی اوسلو معاہدے میں ضروری ردّوبدل اور بنیادی اصلاحات نہ کی جائیں۔

جو اصلاحات میں تجویز کر رہا ہوں وہ بنیادی طور پر دو معاملات کے بارے میں ہیں۔ان میں سے پہلی تجویز امن عمل اور قومی حکومت دونوں حوالوں سے فلسطین کی نمائندگی سے متعلق ہے۔جبکہ دوسری اوسلو طریق کار کے اب تک قابل عمل ہونے کے سوال سے تعلق رکھتی ہے۔خصوصاً اس تناظر میں کہ یہ وقت کی ایک خاص میعاد کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا جو بہت پہلے یعنی ۱۹۹۹ء میں ختم ہو چکی۔یہ سوال کہ فی الحقیقت فلسطینی عوام کی نمائندگی کا اختیار یا استحقاق کون رکھتا ہے، موجودہ فلسطینی انقلاب کے ابتدائی دنوں سے فلسطینی اور عرب مباحثے کی ایک نمایاں خصوصیت رہا ہے۔تاہم ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط سے صرف فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کو کلی اختیار دینے کی تحریک نے زور پکڑا، اور ۱۹۹۳ء میں اس کا نتیجہ بالآخر ''فلسطینی عوام کی نمائندہ'' ہونے کی حیثیت سے پی ایل او کی جانب سے اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کی شکل میں برآمد ہوا۔

باہمی قبولیت کے نام پر اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کی یہ شکل انتہائی غیر متناسب سیاق وسباق میں عمل میں آئی۔واضح طور پر اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کی یہ ایسی صورت تھی جس میں ''واحد جائز'' نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اسرائیل کو تسلیم کرنے والے فلسطینی عوام کے نمائندے کے لیے شرائط و خصوصیات کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا اور ایسا باہمی اتفاق کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔لیکن اس معاہدے کو انتہائی غیر متناسب قرار دینے کی وجہ یہ نہیں ہے۔اس سے زیادہ متعلقہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدے کے تحت پی ایل او کو اسرائیل کی طرف سے صرف ایک مشروط منظوری حاصل ہوئی، اس معنی میں کہ پی ایل او کو تو ''اسرائیلی ریاست کے وجود کو امن اور سلامتی کے ساتھ برقرار رہنے کے حق'' کو تسلیم کرنا ہوگا مگر اس کے مقابلے میں اسرائیل کی جانب سے محض اتنی سی بات تسلیم کی گئی کہ فلسطینیوں کو خود اپنی ایک ریاست کے قیام کا حق حاصل ہوگا جبکہ یہ کسی بھی طرح مساوی رویہ نہیں بلکہ اس سے کہیں کم تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح فلسطینی موقف کی قیمت پر اسرائیل کے تاریخی روایتی موقف کو تسلیم کرا لیا گیا۔ مزید یہ کہ اس منظوری کی شکل بھی ایسی رکھی گئی جس سے اسرائیل کو فلسطینی ریاست کے ممکنہ ظہور کی صورت میں اس پر ایک ویٹو پاور حاصل ہو گئی یعنی اگر یہ بات سامنے آئے کہ فلسطینی ریاست اسرائیل کی سلامتی کے لیے کسی بھی طور خطرہ بن سکتی ہے تو وہ اس کے خلاف اقدامات کر سکتا ہے۔ لیکن اس عدم توازن کے باوجود ۱۹۹۳ء کی باہمی قبولیت کے معاہدے نے پی ایل او کے لیے عالمی سطح پر فلسطینی عوام کا واحد نمائندہ تسلیم کیے جانے کی راہ ہموار کر دی۔

اس کامیابی کے اس منفی پہلو کے علاوہ، مزید یہ ہوا کہ اوسلو معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد پی ایل او کو اپنی عظمت رفتہ کی بنیاد پر جانچے جانے کے بجائے اب مکمل طور پر اوسلو معاہدے کے مطابق ۱۹۶۷ء کے اسرائیلی مقبوضہ علاقوں پر مشتمل کامل خود مختار فلسطینی ریاست کے قیام کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ بدقسمتی سے پی ایل او کو جب اس معیار پر جانچا جاتا ہے تو نتیجہ ایک مایوس کن ناکامی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اوسلو معاہدہ ''عبوری مدت'' کے اندر فلسطینی ریاست کے قیام میں واضح طور پر ناکام رہا ہے۔ مزید یہ کہ مستقبل قریب میں ایسا ہونے کے امکانات اس وقت کے مقابلے میں یقینی طور پر بہت دھندلے ہیں جب یہ معاہدہ عمل میں آیا تھا۔

اس صورت حال نے فلسطینی ریاست کے قیام کے امکانات کے بتدریج کم ہوتے چلے جانے کا تاثر ابھارا ہے۔ اس کے نتیجے میں اداسی کے احساسات نے جنم لیا ہے۔ اس کیفیت میں مقبوضہ فلسطینی علاقے غزہ اور غربِ اردن، دونوں جگہوں پر ناقابل برداشت انسانی مصائب کی وجہ سے بلاشبہ بہت اضافہ ہوا ہے۔ غزہ میں وقتاً فوقتاً فوجی کارروائیوں سے رونما ہونے والے المیوں کے علاوہ لوگوں کو مستقل طور پر پانی اور بجلی کی شدید قلت، ناکافی شہری سہولتوں اور سفر پر عملاً مکمل پابندی کا سامنا ہے۔ جبکہ غرب اردن میں فلسطینیوں کا اپنے ملک میں عزت کے ساتھ رہنے کا حق انتہائی بے لگام اور جابرانہ فوجی تسلط نیز یہودی آبادکاروں کی انتہا پسندی اور کھلے تشدد پر مبنی رویوں کے سبب بری طرح

مجروح ہو رہا ہے۔ ان عوامل نیز اس حقیقت نے کہ فلسطینی اتھارٹی کبھی اچھی حکمرانی نہیں کرسکی، پی ایل او کو بہت نقصان پہنچایا۔ تاہم شاید بالآخر پی ایل او کے وجود پر جس وجہ سے سمجھوتہ کیا گیا وہ اس کی جانب سے عدم تشدد کے رویہ کا اختیار کیا جانا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نقطہ نظر کو کہ ''تشدد کارآمد ہوتا ہے'' بڑے پیمانے پر لوگوں کی حمایت حاصل ہوتی چلی گئی جس کے نتیجے میں پی ایل او کے بجائے دوسرے مزاحمتی گروپ زیادہ مقبول ہو گئے۔ اس لیے اب فلسطینیوں کی نمائندگی میں ردّوبدل ناگزیر ہے۔ لیکن یہ ردوبدل اوسلو فریم ورک کے بنیادی مسئلے سے نمٹنے میں بھی سہولت فراہم کرسکتا ہے جو ایک عبوری بندوبست کو ایسے قابل عمل بندوبست کی شکل دینا ہے جو اس وقت تک کارآمد رہے جب تک مسئلہ حتمی طور پر حل نہ ہو جائے۔ اس مسئلے کے حل میں ناکامی ایک مضحکہ خیز صورت حال کو جنم دے گی جو یہ ہے کہ فلسطینیوں کو آئندہ بھی اِن دو راستوں میں سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور رہنا ہوگا کہ یا تو اسرائیل جو کچھ انہیں بات چیت میں پیش کرنے پر تیار ہو اسے قبول کرلیں یا پھر اس کے ظالمانہ تسلط میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں۔ جو ردوبدل میں تجویز کررہا ہوں اس کا مقصد مختصراً یہ ہے کہ قابض ریاست اور مقبوضہ لوگوں کے درمیان طاقت کے توازن میں پائے جانے والے بنیادی عدم تناسب کو درست کیا جائے۔ یہ مندرجہ ذیل چار کلیدی نکات پر مشتمل ہے:

۱) اکیس سال پہلے فلسطینیوں کی طرف سے امن اور سلامتی کے ساتھ اپنے قائم رہنے کے حق کے تسلیم کیے جانے کے بعد اسرائیل کو بھی مساوی سلوک کرتے ہوئے فلسطین کے اس پورے علاقے پر جس پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا، فلسطینیوں کے ایک خودمختار ریاست کے حق کو تسلیم کرنا چاہیے۔

۲) فلسطینی علاقے پر قبضہ ختم کرنے کے لیے اسرائیل کو بین الاقوامی طور پر مقرر کردہ کسی تاریخ کو قبول کرنے اور اس کی واپسی کے لیے باہمی اتفاق سے طے پانے والے طریق کار پر رضامند ہو جانا چاہیے۔

۳) عبوری مدت کے دوران قومی اتحاد کے حصول کے ضمن میں فلسطینیوں کو اپنی کوششوں کو بین الاقوامی برادری کی جانب سے چار طاقتوں کے طے کردہ اصولوں کے بے لچک اطلاق پر اصرار کر کے نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ یہ اصول جیسے فلسطینی حکومت سے باہمی قبولیت کے خطوط (Letters of Mutual Recognition) کو مکمل طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ویسے ہی یہ شرائط بھی اسی فریم ورک کا حصہ ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔

۴) فلسطینیوں کو ایسی تمام سرگرمیوں سے علیحدگی پر غور کرنا چاہیے جو ان کے اپنے وطن میں عزت اور وقار کے ساتھ رہنے کے حق کو متاثر کرتی ہیں، تاکہ وہ مکمل قومی یکجہتی کی جانب قدم بڑھا سکیں اور اپنی ریاست کی تعمیر اور اسے کامیابی سے چلانے کی تیاری کی کاوشوں کو ثابت قدمی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔

ان اصلاحات کو یقینی بنانے کے کام کو تیزی سے مکمل کرنے کی کلید فلسطینیوں کی جانب سے پورے عزم کے ساتھ زیادہ ہمہ گیر نمائندگی کے حامل فریم ورک کے ذریعے اتحاد و یکجہتی کا حصول ہے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر غور کیا جانا چاہیے۔

پی ایل او کی رکنیت میں انتخابات یا کسی اور متفقہ معروضی طریقے سے توسیع ممکن ہونے تک، میری تجویز ہے کہ پی ایل او کو اس کے پلیٹ فارم سمیت تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اس اجازت کے ساتھ کہ وہ ''فلسطینی عوام کی واحد جائز نمائندہ'' ہونے کے خطاب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

یونیفائیڈ لیڈر شپ فریم ورک (یو ایل ایف) کو۔ جس میں پی ایل او کے تمام دھڑوں کے علاوہ اس سے غیر منسلک گروپ بھی شامل ہیں۔ اہم قومی مفاد کے معاملات سے متعلق پی ایل او کی مجلس عاملہ کے فیصلوں سے اجتماعی طور پر باخبر رکھنے کی ذمے داری دی جانی چاہیے۔

پی ایل او سے غیر منسلک گروپوں کی یو ایل ایف میں رکنیت کے لیے پی ایل او کے پلیٹ فارم سے منظوری کی ضرورت نہیں۔ تاہم اس بات پر غور کیا جاسکتا ہے کہ یو ایل ایف فیصلہ کرے کہ اس میں

شامل تمام دھڑے ایک متعین وقت تک تشدد پر مبنی سرگرمیاں بند رکھیں گے۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ علاحدگی کو سات سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد عدم تشدد کے عزم کی میعاد کو اس مدت کے مطابق ہونا چاہیے جو حکومت کو ریاستی اداروں اور قوانین کو ہم آہنگ کرنے کے قابل بنانے کے لیے درکار ہو۔ اس بات کو یقینی بنانا بھی اہم ہے کہ حکومت تمام سیاسی گروپوں کی نمائندہ ہو اور اسے بنیادی قانون کے ذریعے مکمل طور پر بااختیار بنایا گیا ہو۔ حکومت کو تمام گروپوں کی شمولیت کے ساتھ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کا پختہ عزم کرنا چاہیے۔ یہ کام اُس مدت کے اختتام سے کم از کم چھ ماہ پہلے ہو جانا چاہیے جو عدم تشدد، تعمیر نو نیز قوم کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہو۔ دریں اثناء فلسطین کی موجودہ مقننہ کو از سر نو یکجا کر کے سیاسی نظام کو وسیع تر شرکت کی بنیاد پر تشکیل کے لیے کھول دیا جانا چاہیے۔ اس مرحلے پر جو چیز انتہائی مطلوب ہے وہ ان مذکورہ اور دیگر ممکنہ امور پر قومی اتفاق رائے ہے۔ اس قومی اتفاق رائے، بالخصوص اس ضمن میں مقرر کیے جانے والے نظام الاوقات کو اسرائیل اور بین الاقوامی برادری سے رابطے کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد اسرائیلی قبضے کے خاتمے کی حتمی تاریخ کا تعین اور تمام حل طلب چلے آنے والے مسائل کے تصفیے کی جانب پیش رفت ہونا چاہیے۔

سطور بالا میں بیان کیے گئے امور پر فلسطینی قومی اتفاق رائے کی تشکیل کی کوشش کے علاوہ، اس اتفاق رائے کے لیے دو دیگر پہلوؤں کو بھی خاطر خواہ طور پر ملحوظ رکھنا اہم ہوگا۔ ایک یہ کہ اچھی حکمرانی ہمیشہ اور ہر جگہ ضروری ہوتی ہے۔ فلسطین کے سیاق میں بھی یہ انتہائی اہم ہے کیونکہ یہی چیز اس کے جواز کو زیادہ مستحکم کر سکتی اور بین الاقوامی توجہ اور تعاون کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک علاقے کی المناک طور پر فقید المثال انتہا پسندی اور تشدد کا شکار ہو جانے کے پس منظر میں، وہ اساسی اصول جن پر فلسطینی ریاست کو استوار ہونا چاہیے، خصوصی توجہ اور اہمیت کے مستحق ہیں۔ لہٰذا فلسطینیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ جو ریاست تعمیر کریں اس کی بنیاد برابری، برداشت، عدم امتیاز اور کشادگی کے

عالمی طور پر تسلیم شدہ اصولوں، نیز شہریت کے کامل حقوق اور مراعات کے مکمل احساس و ادراک پر رکھی گئی ہو۔ میری نگاہ میں ایسی ہی ریاست فلسطینیوں کی امنگوں اور عظیم قربانیوں کے شایان شان ہو سکتی ہے۔

[سلام فیاض، فلسطینی اتھارٹی کے سابق وزیراعظم ہیں اور آج کل اٹلانٹک کونسل میں ''ڈسٹنگویش اسٹیٹ مین'' کی حیثیت سے ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔]

(ترجمہ: ثروت جمال اصمعی)

Source: http://www.foreignaffairs.com/articles/142134/salam-fayyad/oslo-is-dead